۱۵

ایک نئے عہدِ ظلمت کی دستک

گذشتہ تین صدیوں سے مغرب ایک طرح کے فریب نظر کا شکار ہے بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فکری آزادی نے مغرب کا ذہنی افق منور کر رکھا ہے لیکن فی الواقع ایسا ہے نہیں۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب کانٹ نے مغرب میں حریت فکر و نظر کا علم بلند کیا تھا اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ ایک ایسے عہد میں سانس لے رہا ہے جب روشنی کی تلاش کا عمومی احساس پیدا ہو چلا ہے البتہ اس عہد کو ابھی عہدِ تنویر یا روشن یافتہ عہد (Enlightened Age) نہیں کہا جا سکتا۔ تب مغرب میں امید کی لے بہت تیز تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انسانی دل و دماغ جو مدت سے غور و فکر کی لذت سے نا آشنا تھے، اب اعتماد کے نئے جلووں کی آماجگاہ ہیں۔ کانٹ کے بقول انسانی ذہن نے اپنے اوپر یہ پابندی خود عائد کی تھی کہ وہ پچھلوں کے مقابلے میں تحلیل و تجزیئے اور غور و فکر کا متحمل نہیں رہ گیا ہے۔ جب ایک بار اس واہمہ کے غبارے سے ہوا نکل گئی تو ایک عقلی رویے کی تشکیل کی راہ ہموار ہو گئی جو گویا اس بات کی ضمانت تھی کہ آنے والے دنوں میں اس عقلی رویے کے ذریعے ایک نئی مثالی تہذیب کی داغ و بیل رکھی جا سکے گی۔ مغرب میں Enlightenment کے بعد، آنے والے دنوں میں، ایک عقلی انسان کی تشکیل کا کام زور و شور سے جاری رہا۔ ابتداً تو ایسا محسوس ہوا کہ انسانی عقل ایک متبادل دنیا کی تزئین و ترتیب کا کام انجام دے سکتی ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے بطن سے جمہوریت کا ظہور، ان براعظموں کی دریافت جن کے تذکرے سے بائبل کے صفحات خالی تھے، یا بائبل کے تصور کائنات کے برخلاف ایک ایسی دنیا کی دریافت جہاں زمین جامد نہ ہو بلکہ کائنات ہر آن آگے بڑھ رہی ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نئی ٹیکنالوجی کی ایجاد سے انسان کے قوتِ کار اور اس کے اختیار میں اضافہ، یہ سب کچھ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس نے عقلی انسان کو خود اعتمادی سے متصف کیا۔ یہ خیال کہ آنے والے دنوں میں کائنات کی شاہِ کلید اب انسانوں کے ہاتھ میں ہوگی، اور یہ

کہ نئی دنیا کی تعمیر کے لیے عقل پر انحصار کافی ہے افسوس کہ بہت زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں انسانی توقعات پر مایوسی کی دھند دبیز ہوتی گئی۔ ابتداً جو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ خدا کائنات کی تخلیق کے بعد لاتعلق ہو گیا ہے اب اس خیال نے آگے چل کر دہریت کے فلسفے کو وجود بخشا۔ مغرب کا ذہنی افق بہت جلد نہلزم، اسٹرکچرلزم اور ایگزسٹینشیلزم جیسے قنوطی نظریات کی آماجگاہ بن گا۔ دو عظیم جنگوں کی تباہی اور اوشوٹس کی تجربہ گاہ میں نازیوں کی بربریت نے فطرتِ انسانی کے بارے میں ہلا مارنے والی قنوطیت کو جنم دیا۔ یہ اسی عمل کا تسلسل ہے کہ آج اکیسویں صدی کی ابتداء میں جب امریکی استعمار نے پوری دنیا پر دہشت کی جنگ تھوپی ہے، صاف محسوس ہوتا ہے کہ مغرب میں روشنی کا ظہور محض ایک واہمہ تھا۔ جن لوگوں نے گذشتہ تین سو سالوں میں تہذیب کی قیادت کی ہے وہ بالآخر ہمیں ایک ایسی تاریک گلی میں لے آئے ہیں، جہاں آگے راستہ مسدود ہے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ تو کیا ایک نیا عہدِ ظلمت ہمارے دروں پر دستک دے رہا ہے؟

مغرب میں حریتِ فکر کی تحریک جس طرح آگے بڑھی اس میں ایک بنیادی نقص تھا۔ خدا کو دیس نکالا دے کر انسان نے اپنے اوپر ڈھیر ساری ذمہ داری عائد کر لی تھی۔ مروجہ مذاہب کے محاکمہ کے بجائے اسے یکسر رد کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی عقل کے لیے ٹیک لگانے کو کوئی بنیاد نہ رہی۔

ایک ایسی دنیا میں، جہاں خالق تخلیق کے بعد پس پردہ چلا گیا ہو، جیسا کہ حریت افکار کے ابتدائی علمبرداروں کا خیال تھا، انسانوں کے لیے کائنات میں اپنے مقام کا صحیح تعین اور معنویت کی تلاش مشکل ہو گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ حریت افکار کی اس تحریک نے فکر انسانی پر زبردست اثرات مرتب کیے۔ مغرب میں ہمیشہ ہمیش کے لیے غور و فکر کا انداز بدل گیا۔ ایک نئی دنیا آباد ہوئی۔ البتہ یہ احساس ہر دور میں کسی نہ کسی حد تک پایا جاتا رہا کہ جیسے زندگی میں کہیں کچھ خلاء رہ گیا ہو۔ اس پُر ہیبت کائنات میں چھوٹے سے انسان کی بساط ہی کیا ہو سکتی تھی جسے اب سب کچھ خود آپ ہی انجام دینا تھا اور اس عمل میں اسے عقل کے علاوہ کسی اور سہارے کی امید نہ تھی۔ شاید انسان اتنے بڑے بوجھ کا متحمل نہ تھا۔ نیٹشے نے ایک خیالی دیومالائی انسان Übermensch کی ضرورت محسوس کی اور اس طرح بات بالآخر وہیں پہنچی کہ انسانوں کی نجات کے لیے کوئی دیومالائی مسیحا پردۂ غیب سے ظاہر ہو۔ گو کہ عیسائی یا یہودی مسیحا کے بالمقابل نیٹشے کے دیومالائی انسان کو اسی سرزمین پر تخلیق کیا جانا تھا لیکن ان باتوں سے کم از کم یہ احساس تو ضرور پیدا ہوا کہ محض عام گوشت پوست کے انسان کے بس میں نہیں کہ وہ جدید دنیا کا چیلنج قبول کر سکے۔

ڈیسکارٹ نے جب بانگ دہل اس بات کا اعلان کیا کہ میں چونکہ سوچتا ہوں اس لیے میرا وجود ثابت شدہ ہے (cogito ergo sum) تو وہ دراصل انسانی زاویۂ فکر میں ایک بڑی تبدیلی کا اعلان کر رہا تھا۔ یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ آنے والے دنوں میں انسانی تہذیب خدا کے بجائے انسان کے گرد گردش کرے گی اور اس کی تقدیس کا نغمہ گائے گی۔ گویا

مستقبل میں علم صرف اسے کہا جاسکے گا جس کی صداقت انسانی حواس کے ذریعے ہوسکتی ہو۔ انسان کو خدا کے مقام پر لا بٹھانا نئی تہذیب کی تاراجی کا سبب بن گیا۔ عقل پر کلی انحصار کے سبب اب انسانی بصیرت نام تھا a priori اور posteriory کے مجموعے کا۔ وحی اور وجدان کے لیے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ انسان خود اپنا پیمانہ تھا۔ وہی عبد بھی تھا اور معبود بھی۔ اس صورت حال نے ایک نئی مذہبی حسیت کو جنم دیا جسے Humanism بمعنیٰ انسان دوستی یا کسی حد تک انسان پرستی کا نام دیا گیا اور جس کی بنیاد پر جمہوریت کا سیاسی فلسفہ تراشا گیا۔

لیکن مصیبت یہ تھی کہ انسان کوئی متعین یا غیر متبدل قدر اور پیمانہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس کو بنیاد بنا کر جو فلسفۂ زندگی تعمیر کیا گیا اسے ثبات مشکل تھا۔ جمہوریت انسانی توقعات پر کبھی پوری نہیں اتری۔ مختلف ادوار میں اس کے معانی بدلتے رہے۔ کبھی اسے نو آبادیاتی نظام کی خدمت پر مامور کیا گیا تو کبھی اس نے انسانی قتل عام کو جواز بخشا اور کبھی جمہوری نظام کی کوکھ سے عوامی تباہی کے ہتھیار اور ایٹم بم برآمد ہوئے۔ فی زمانہ جب یہ احساس عام ہے کہ ہم مابعد جدیدیت کے عہد میں تاریخ کی آخری شام کے جھٹپٹے سے دوچار ہیں، زندگی کا وقوعہ ختم ہوچکا ہے، ایک اکتا دینے والی یکسانیت ہمارے حواس میں سرایت کر گئی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روحانی زندگی کا رمق ہمارے وجود سے رخصت ہوگیا ہے، ایسا لگتا ہے گویا ہر لمحہ ہمارے اندرون میں ایک اجنبی وحشی پروان چڑھ رہا ہو۔ مغرب میں خدا کی موت کا اعلان بالآخر انسان کی اپنی موت پر منتج ہوا۔ انسان کے اندرون میں انسان نے دم توڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں جمہوریت اور فسطائیت ایک ہی چیز کے دو نام سمجھے جاتے ہیں۔ جمہوریت نے اپنے طویل سفر میں سرمایہ داروں کی بھرپور معاونت کی۔ اسی کے سہارے مختلف جمہوریتوں میں موروثی خاندانی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ کبھی اس نے فوجی آمروں کو جواز فراہم کیا تو کبھی کھلی فسطائیت جمہوری تماشے کا حصہ سمجھی گئی۔ یہ تمام نظریئے بنیادی طور پر انسان کی تقدیس سے عبارت تھے۔

توقع تھی کہ حریت فکر کی تحریک انسان کو جھوٹے خداؤں اور توہمات سے نجات دلائے گی، لیکن عملاً ہوا یہ کہ توہمات کی گرم بازاری تو اسی طرح قائم رہی البتہ انسانوں کو اپنے ہی جیسے انسانوں کے پیدا کردہ نئے عذاب کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ گذشتہ تین صدیوں میں عقل وخرد کے مارے انسانوں نے انسانوں پر جو ظلم روا رکھا ہے جس کی ایک جھلک صنعتی انقلاب سے لیکر عصر حاضر میں برپا ہونے والی تیل کی جنگوں میں دیکھا جاسکتا ہے، اور جسے مہذب قومیں ''دہشت کے خلاف جنگ'' جیسی اصطلاحوں میں چھپاتی ہیں اس خیال کی تصدیق کے لیے کافی ہے کہ اوشوٹس، ہیروشیما، گوانتانامو اور ابوغریب میں جو کچھ ہوا وہ محض حادثاتی امر نہ تھا بلکہ اس فکری رویے کا منطقی لازمہ تھا۔ آج ایک بار پھر دنیا کو فریڈرک نیٹشے کے فسطائی عزائم سے سابقہ ہے جس نے اپنے فکری مغ بچّہ دریدہ کے ذریعے عصر حاضر کو ایک تلاطم سے دوچار کر رکھا ہے۔ نیٹشے کا دیومالائی انسان (Übermensch) جسے اس کی

تصوراتی دنیا میں کلیدی حیثیت حاصل ہے کمزوروں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔ نیٹشے نہ صرف یہ کہ نازی جرمنی میں سرکاری فلسفی کی حیثیت سے دیکھے گئے بلکہ مسولنی جیسے لوگ بھی ان کی تحریروں سے فکری غذا حاصل کرتے تھے۔ اور اب جو لوگ خود کو مابعد جدیدیت کا علمبردار کہتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی نیٹشے کو فکری پیشوا کی حیثیت حاصل ہے۔ دریدہ، فوکو، ڈیلیوز یہ سب کے سب فکری طور پر نیٹشے کے شاگرد ہیں اور ان کے دل ودماغ پر حسن، اخلاق اور سچائی کے سلسلے میں نیٹشے کی ہلا مارنے والی بے معنویت (Nihilism) کے اثرات خاصے نمایاں ہیں۔ ان تلامذہ کو معانی کی تحریف وتبدیلی میں جو غیر معمولی کامیابی ملی ہے یا اگر یہ ہمیں یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ معانی متن سے رخصت ہوسکتی ہے اور پھر بھی ان کا یہ خیال کو متن کے باہر کچھ بھی نہیں ہے (il n'y a pas de hors-texte) انسانی فکر پر اب تک کا سب سے خطرناک حملہ ہے۔ اس طرز فکر نے زبان کے سلسلے میں ہمارے تصورات کو بڑی حد تک منہدم کر دیا ہے۔ اگر زبان کے بنیادی فریضے کے سلسلے میں شبہات وارد ہو جائیں تو پھر غور وفکر اور فلسفیانہ مباحث کا اعتبار کیسے قائم رہ سکے گا؟

انسانی عقل کے سہارے خوابوں کی ایک نئی دنیا تعبیر ہوسکی اور نہ ہی کانٹ کا متوقع عہد پرُنور (Enlightened Age) ہمارے تجربے کا حصہ بن سکا۔ البتہ اس کے برعکس یہ ضرور ہوا کہ آج ہم ایک ایسی صورتحال سے دوچار ہیں جسے دریدہ جیسے لوگ logo-centrism یا عقلی نظام جبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ حریت فکری کی تحریک جب ایک بار بے سمتی کا شکار ہوگئی تو انسانی معاشرہ کا بحران میں مبتلا ہونا فطری تھا۔ یہ جو ہر طرف آج ڈی کنسٹرکشن کا غلغلہ بلند ہے اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ اب اقدار کو ثبات نہیں اور اس نظری سناٹے میں معانی کی دریافت مشکل ہے۔ مثال کے طور پر دریدہ جب یہ کہتا ہے کہ مسلّمات خواہ وہ اخلاقی ہوں، دستوری ہوں یا قانونی ان کے بس کا نہیں کہ وہ تمام مخصوص صورت حال میں یکساں انصاف کے قیام کی ضمانت دے سکیں تو بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ انفرادی آزادی کی وکالت کر رہے ہوں۔ لیکن اس کے مضمرات پر غور کیجئے تو دراصل یہ زاویۂ فکر ہمارے مستحکم اقدار کی چولیں ہلا رہا ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی طرزِ فکر نے صدر بش کی سیاسی وجودیت کو جواز فراہم کیا ہے۔ اگر کوئی اخلاقی اصول یا دستوری ضوابط قیام انصاف کے لیے قطعاً مہمل ہے اور اگر کوئی انتہائی غیر اخلاقی سیاسی فیصلہ بھی انسانوں کے لیے اتنا ہی منفعت بخش ہوسکتا ہے جتنا کہ کوئی سوچی سمجھی اخلاقی رائے تو پھر اوٹشوٹس، ابوغریب اور گوانتانامو میں جو کچھ ہوا اسے قابلِ نفریں قرار دینے کا جواز کیا ہوگا؟

مغرب میں حریتِ فکرِ انسانی کی تحریک جس بے سمتی کا شکار ہوئی اس کے منطقی ثمرات اب دیکھنے کو مل رہے ہیں جب یہ احساس عام ہے کہ بند تاریک گلی میں آگے راستہ مسدود ہے۔ بعض اسے تاریخ کے خاتمے سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ نظری خلاء کا یہ عہد دراصل تہذیب کا وقتی گہن ہے۔ البتہ جو لوگ صورت حال کا کسی قدر ادراک رکھتے ہیں وہ اس صورت حال

میں صرف پریشان ہی نہیں بلکہ خود کو بے بس بھی محسوس کرتے ہیں سرمایہ داروں کے جمہوری تماشے نے دنیا کو چند بڑے تاجروں کی مٹھی میں دے دیا ہے۔ گلوبلائزیشن کے سخت شکنجوں میں فرد کی حیثیت ماہیٔ بے آب کی ہے۔ ذرائع ابلاغ نے ہماری بصیرت پر دبیز پردے ڈال رکھے ہیں۔ ہمیں وہی کچھ نظر آتا ہے جو ان کا کیمرہ دکھانا چاہتا ہے۔ فطری وسائل کے بے محابا استعمال پر روک لگانے کے لیے کوئی موثر قوت نہیں رہ گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلحوں کی دوڑ اور ماحولیات کی مسلسل تباہی رفتہ رفتہ اس کرۂ ارض پر زندگی کے امکانات معدوم کرتی جارہی ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کی شب ظلمت اب ہم پر سایہ فگن ہونے کو ہے۔

جدید مغرب میں اب ایسی کوئی مسلمہ قدر نہیں رہ گئی ہے جس کی بنیاد پر نیک و بد کا فیصلہ کیا جاسکے۔ اگر ایک طرف ہم خود کو ان خوش قسمتوں میں سمجھتے ہیں جنہیں طب و صحت کی جدید سہولتوں نے طویل العمری عطا کی ہے۔ سفر کی سہولتوں نے ہمارے لیے جلوۂ کائنات کے مواقع فراہم کیے ہیں، کوہ و دشت کی وسعت اور فضاؤں کی بلندی ہمارے تصرف میں آگئی ہے، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے ہمیں جامِ جمشید کا لطف عطا کیا ہے تو دوسری طرف بے لطف، یکسانیت کی ماری، خالی خولی زندگیاں ہر لمحہ ہم سے سوالی ہیں کہ آخر اس تمام دوڑ دھوپ کا حاصل کیا ہے؟ آخر وہ کیا چیز ہے جو کھوئی گئی ہے جس کے بغیر زندگی بے لطف ہے۔ وہ مسرت آمیز زندگی، وہ طرب انگیز لمحے جب محض جئے جانا بھی ایک لطف تھا آخر کہاں رخصت ہوگئے۔ صورت حال کے تدارک کے لیے مشرق و مغرب میں ایسے روحانی اداروں اور صوفی منشوں کا ایک سیلاب سا آگیا ہے جو خالی خولی زندگی کو مسرت سے ہم آہنگ کرنے کی ضمانت دے رہے ہیں۔ مغرب میں گذشتہ چند برسوں میں یہودی تصوف کے علمبردار قبالائی مراکز کو خاصا فروغ حاصل ہوا ہے۔ بعض ایسے فرقے بھی وجود میں آئے ہیں جو غم کے ماروں کو جنت میں راست داخلے کی بشارت سناتے رہے ہیں۔ بہت سے لوگ خودکش اشیاء کے استعمال کے ذریعے عازمین جنت میں شامل ہو چکے ہیں اور بہت سے ابھی اس بارے میں شش و پنج میں مبتلا ہیں۔ تو کیا جدید مغربی معاشرہ، جس کا مشرق بھی کسی قدر لاحقہ بنتا جارہا ہے ایک عمومی خودکشی کی صورت حال سے دوچار ہے؟

اڈورنو اور ہارکیمر کی اس بات میں محض جزوی صداقت ہے کہ عقل بذاتِ خود بے عقلی کے راستے پر چل نکلی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صورت حال جتنی دھماکہ خیز ہے اس پر قابو پانا تنہا بے چاری عقل کی بساط سے باہر ہے۔ جب صورت حال ایسی دھماکہ خیز ہو تو انسانی عقل کے لیے حواس کھو دینا چنداں تعجب کی بات نہیں۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جب انسان معجزات و کرشمات سے دادرسی کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کاش بیٹھے بیٹھائے کوئی معجزہ ہوجائے۔ ایک خالص غیر عقلی رویہ اس کی امیدوں کا واحد سہارا رہ جاتا ہے۔ اکیسویں صدی کی ابتداء میں بدقسمتی سے ہم خود کو ایک ایسی ہی صورت حال میں گھرا پاتے ہیں۔ آیئے ان امور کا قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے۔

ناعقل پسندی

حریتِ فکر کی تحریک شروع تو اس دعوے سے ہوئی تھی کہ وہ انسان کو اپنی ہی عائد کردہ احساس کمتری سے نجات دلائے گی۔ فرد اپنے امور کا مختارِ کل ہوگا، اسے کسی شیخ یا پیر کلیسا کا دامن تھامنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن آج جب اس تحریک کو کوئی تین سو برس ہونے کو آئے ہیں اس کے بطن سے جو کچھ برآمد ہو رہا ہے وہ انتہائی مایوس کن ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ بظاہر تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسانوں کی ایک قابل ذکر تعداد آج سکون کی تلاش میں اشتہاری عاملوں اور نیم خواندہ روحانیوں کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ عہد جدید کے یہ عامل خود کو لائف اسٹائل گُرو اور ماہرینِ لطف و انبساط کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ کسی کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ اس نے عہدِ جدید کے خودسر بچوں کو قابو میں رکھنے کا فن دریافت کرلیا ہے تو کوئی اس بات کا دعویدار کہ وہ آپ کی روحانی اور نفسیاتی الجھنوں کا مداوا کرسکتا ہے۔ دراصل یہ وہ لوگ ہیں جو کہنے کو تو نئی اصطلاحوں میں کامیاب خوشگوار زندگی کے معلمین ہیں لیکن فی الواقع ان کی حیثیت اس عہد بے عقلی کے شیوخ کی ہے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جو ان حضرات کے تصرف سے بچا رہ گیا ہو۔ مقبول عام کتابوں کا ایک امنڈتا سیلاب ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کی سیر کیسے کریں، چیزوں کو کیسے دیکھیں، سوچنے کا صحیح طریقہ کیا ہے، حتیٰ کہ آپ کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ آپ اپنے احساسات کو کس طرح ترتیب دیں۔ لباس کی تزئین و آرائش سے لے کر کتاب پڑھنے کے فن، دوست بنانے کا گُر، معشوق کو دامِ محبت میں گرفتار کرنے کا ہنر گویا ہر مسئلہ میں یہ آپ کی رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔ بظاہر تو یہ آپ کو زندگی جینے کا فن (Art of Living) سکھاتے ہیں لیکن فی الواقع ان حضرات نے ہماری ناکامیوں، محرومیوں اور خوش عقیدگیوں کے طفیل خود کو زندہ رکھنے کا فن دریافت کرلیا ہے۔ عہدِ جدید کے روحانی عاملین کا یہ کاروبار اب اربوں ڈالر کی ایک وسیع انڈسٹری بن چکا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں صرف ایک دیپک چوپڑا کی سالانہ آمدنی بیس ملین ڈالر تک جا پہنچی ہے۔ برطانیہ میں ذہنی الجھنوں سے نجات دلانے کی دعویدار ایک خاتون گینا ایکرس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ملاقات اور چند کلماتِ تسلی کے لیے دو ہزار پونڈ تک کی رقم وصول کرلیتی ہیں۔ مغرب میں قبالائی مراکز کی گویا بہار سی آئی ہوئی ہے۔ بڑی بڑی دولت مند عوامی شخصیتیں اور فلمی ستارے مثلاً میڈونا، الزابتھ ٹیلر، ایشٹن کوچر، بروٹنی اسپیئرس اور ڈینی مور وغیرہ ان مراکز کے مستقل گاہک ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قبالائی پانی مختلف امراض کے لیے اکسیر ہے اور یہ کہ قبالائی دھاگے کو ہاتھ پر باندھے رکھنے سے منفی اثرات اور نظر بد سے بچا جاسکتا ہے۔

محض ہالی وڈ کے اداکار ہی اس دام فریب میں مبتلا نہیں ہیں۔ حکومت کے اعلیٰ عہدے دار حتیٰ کہ بعض ریاستوں کے صدور بھی کوئی اہم اقدام اٹھانے سے پہلے ان عاملینِ غیر صالحین کے ابرو اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ سابق امریکی صدر رونالڈ ریگن

توہم پرستی کے لیے خاصے معروف تھے۔ان کے سرکاری کاموں کا گوشوارہ بھی نجومیوں کی ایماء سے مرتب کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۸۵ء میں جنیوا مذاکرات کے موقع پرانھوں نے اپنے نجومی جان کوئنگلی سے خاص طور پر یہ درخواست کی تھی کہ وہ ستاروں کے زایچوں کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس موقع پر گورباچوف کس طرح پیش آئیں گے۔کلنٹن اوران کی اہلیہ کھلے عام روحانی عاملین کے رابطے میں رہے ہیں۔ہالی وڈ کے معروف روحانی عامل میرن ویلینسن اور کامیاب زندگی کے پیرومرشد انٹونی رابنس اور اسٹیفن کووی جیسے لوگوں سے سابق امریکی صدر بل کلنٹن کے گہرے رابطے زبان زدخلائق رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ ہلیری کوئی قدم اٹھانے سے پہلے جین ہوسٹن سے ضرور مشورہ کرتی ہیں جو اپنے آپ کو مقدس ماہرنفسیات کے طور پر پیش کرنے میں یدطولیٰ رکھتی ہیں۔اس سلسلے میں سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر اوران کی اہلیہ چیری کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔کہا جاتا ہے کہ ۲۰۰۱ء میں میکسکو کے ایک تفریحی سفر کے دوران ان دونوں نے از سرِنو پیدا ہونے کا لطف حاصل کیا۔اس رسم کے مطابق پہلے وہ خوشبو سے بسے کیچڑ میں لت پت ہوگئے پھرایک دوسرے پر پپیتے اور تربوز اچھالتے رہے یہاں تک کہ ان حضرات نے اپنے اندر ایک نئی شخصیت کے وجود کی دستک سنی۔ ہندوستان جو روحانی عاملین اور توہم پرستی کا روایتی گہوارہ ہے یہاں آج بھی آئے دن ایسے واقعات دن کی روشنی میں ہوتے رہتے ہیں جس کی کوئی عقلی توجیہ ممکن نہیں۔ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب نجومیوں نے سابق وزیراعظم نرسمہاراؤ کے لیے یہ کہہ کر مشکل کھڑی کردی تھی کہ ان کے لیے سرکاری رہائش گاہ خالی کرنے کا مناسب وقت دس جون کی تاریخ ہے جب کہ نئے وزیراعظم کو یہ بات بتائی گئی کہ چھ جون کو سرکاری رہائش گاہ میں ان کا داخلہ نیک شگون کی علامت ہے۔توہّم کے ماروں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ دونوں وزیراعظم چند دنوں کے لیے ایک ہی مکان میں قیام پذیر رہیں تاکہ ستاروں کے اثرات بد سے بچا جاسکے۔سفلی علوم جو عہدِ وسطیٰ میں لوگوں نے مسترد کردیئے تھے اب دوبارہ روحانی سکون اور متبادل طرزِ زندگی جیسے ناموں سے قبولیت عامہ حاصل کررہے ہیں۔

جب عقل کا چراغ گل ہوتا ہے تو توہّم پسندی اپنی گرفت مضبوط کرلیتی ہے۔آج عہد جدید کی مابعدالطبیعیات کے نام پر کیا کچھ نہیں روا رکھا گیا ہے۔سفلی علوم سے لے کر بھوت پریت کو قابو میں کرنے کے طریقے اور شیطان پرستی سے لے کر فطرت پرستی کے وہ تمام مظاہر جن سے صالح طبیعت اِبا کرتی ہے نئے نئے ناموں سے بازار میں دستیاب ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ نازیوں نے جس انداز سے دنیا برتنے کی کوشش کی اس کے پیچھے دراصل بعض توہمات تھے جسے انھوں نے عقیدے کی حیثیت دے رکھی تھی۔کہا جاتا ہے کہ ویولس برگ کے قلعہ میں جسے جرمن نازیوں کے صدر مقام کا درجہ حاصل تھا پابندی کے ساتھ بعض سفلی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ نازی اس خیال کے قائل تھے کہ دنیا میں آریائی نسل کو خاص امتیاز حاصل ہے جو ان کے عقیدے کے مطابق اٹلانٹس سے اس وقت ہجرت کرگئی تھی جب تیسرا چاند تباہ ہوگیا تھا۔ان لوگوں نے اٹلانٹس اور ہولی گریل کی

تلاش میں خاصی توانائی صرف کی۔ نازیوں کی طرح عہد جدید کے سفلی ماہرین بھی نئی ٹکنالوجی کو اپنے اہداف کے لیے استعمال کرنے کے فن سے واقف ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ توہمات اور ٹکنالوجی کا یہ تعامل بڑے حادثات کو جنم نہ دے۔ شوکو اَسہارا نے جب ٹوکیو کے سب وے میں زہریلی گیس کا حملہ کیا تو وہ دراصل اپنے خیال میں لوگوں کی نجات کے لیے کام کر رہا تھا اور اسی طرح فرقۂ بابِ جنت کے قائد مارشل ایپل وائٹ نے جب دو درجن لوگوں کو خودکشی پر آمادہ کیا تھا تو وہ بھی دراصل اس بے مزہ زندگی سے ایک خیالی سیارے پر ان کی ہجرت کا سامان کر رہے تھے اور ابھی حالیہ دنوں میں جب صدر بش نے عراق اور افغانستان پر حملے کے ذریعے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو وہ بھی اس خیالِ فاسد میں گرفتار تھے کہ فی زمانہ خدا نے انہیں جمہوریت اور آزادی کے فروغ پر مامور کیا ہے۔ کیا ہماری تہذیب حادثات کے گرداب میں پھنس گئی ہے یا یہ سب کچھ محض ابتداء ہے ایک مکمل تباہی کی؟ کارل ساگن سے بہتر اس حقیقت سے نقاب کشائی کون کرسکتا ہے، لکھتے ہیں:

> جب میں اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کے امریکہ کا تصور کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ٹکنالوجی کی طاقت چند ہاتھوں میں مرکوز ہوجائے گی۔ عوامی مفاد کے علمبرداروں کے لیے مسائل کا ادراک ممکن نہ ہوگا۔ لوگ اپنا ایجنڈا خود طے کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں گے اور نہ ہی ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ برسرِ اقتدار طبقے پر موثر تنقید کرسکیں۔ جب لوگ پتھروں کی خاصیت پر یقین کرنے لگیں، اعداد و شمار کے زائچوں سے مستقبل بینی کا کام لیں، ہماری فہم و فراست مسلسل روبہ زوال ہو اور ہمارے لیے حق اور ذاتی پسند میں فرق کرنا مشکل ہوگیا ہو تو سمجھنا چاہئے گویا ہم غیر محسوس طور پر توہمات اور تاریکی کے عہد میں پہونچ چکے ہیں۔
>
> *(The Demon-Haunted Worlds)*

توہّمات

توہمات غیر عقلی رویے کا منطقی لازمہ ہے۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے، یہ ۱۹۹۵ء کی بات ہے۔ وطن عزیز ہندوستان میں اچانک دودھ کے معجزے کا غلغلہ بلند ہوا۔ دیکھتے دیکھتے تعلیم یافتہ اور روشن خیال مرد و زن کا انبوہ کثیر مندروں کے گرد جمع ہونے لگا۔ افواہ گرم تھی کہ مٹی کے بت اچانک دودھ پینے لگے ہیں۔ ٹیلی ویژن چینلوں پر سائنس دانوں کے مابین گھنٹوں یہ بحث چلتی رہی کہ لوگ جس فریب نظر اور پروپیگنڈے کا شکار ہیں وہ دراصل سطح آب کا تناؤ ہے۔ حیدرآباد جسے جدید ہندوستان میں انٹرنیٹ کے شہر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے وہاں جب ایک بار سورج گہن ہوا تو پڑھے لکھے، معقول لوگ محفوظ پناہ گاہوں کی تلاش میں بھاگے پھرے۔ حاملہ عورتیں اس قدر خوفزدہ تھیں کہ انہوں نے بڑی بوڑھیوں کے اس مشورے کو بلاچوں چرا ماننے میں عافیت جانی کہ اس دوران انہیں بدن کھجانے سے احتراز کرنا چاہئے مبادا نومولود کے جسموں پر خراش آجائے۔

دنیا بھر میں توہم پرستی روز افزوں عروج پر ہے۔ اس بات کا اندازہ اخبارات کے ان مقبول عام صفحات سے بھی ہوتا ہے جو

خرافات وتوہمات کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ (horoscope) زائچہ نویسی یا فال معلوم کرنے میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے حالانکہ ان زائچوں کا نہ کوئی عقلی جواز ہے اور نہ ہی سائنس کے عہد میں اس ظلمت پسندی کے لیے کوئی گنجائش ہوسکتی ہے۔ لیکن حال یہ ہے کہ ۱۹۸۴ء کے ایک سروے کے مطابق ۵۵٪ امریکی نوجوان علم نجوم کے قائل ہیں۔ کہنے کو تو یہودی اور عیسائی دونوں مذاہب علم نجوم کے سخت مخالف ہیں۔ موسیٰ بن میمون نے علم نجوم کو علم کے بجائے ایک مرض سے تعبیر کیا ہے اور بقول مارٹن لوتھر علم نجوم دراصل شیطان کی ایجاد ہے لیکن عیسائیت اور یہودیت کے سخت موقف کے باوجود مستقبل شناسوں کا کاروبار عروج پر ہے۔

نظر بد سے حفاظت کے لیے تعویذ اور طغروں کی تجارت ایک بڑے کاروبار کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ ترکی میں تیار کردہ شیشے کے خوبصورت طغرے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ ان توہمات پر صرف اقوامِ غیر کی اجارہ داری نہیں۔ عربوں کے یہاں نظر لگنا اور نظر بد سے بچنے کے مذہبی فارمولے اجنبی نہیں ہیں۔ اہل مغرب جب کسی شخص کو مفلوک الحال، لاغر و نحیف دیکھتے ہیں تو بالعموم ان کا خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص کسی کی نظر بد کا شکار ہوگیا ہے۔ امریکی معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ آئینہ توڑنا خطرناک بدشگونی ہے جو خاندان میں کسی شخص کی موت پر منتج ہوسکتی ہے۔ امریکی ملّاح جب سمندر میں اپنے جہازوں پر ہوتے ہیں تو وہ سیٹی بجانے سے احتراز کرتے ہیں مبادا ان کا سیٹی بجانا سمندر کی خوفناک لہروں کو مشتعل نہ کردے۔ امریکی معاشرے میں یہ مقولہ زبان زد عام ہے کہ سیٹی بجانے والی لڑکیاں اور کٹکٹاتی مرغیاں ہمیشہ انجام بد سے دوچار ہوتی ہیں۔ ہمارے عہد میں وہ توہمات بھی دوبارہ زندہ ہوگئے ہیں جو عرصہ ہوا بیتے دنوں کے ساتھ ہمارے حافظے سے محو ہوگئے تھے۔ مثال کے طور پر اصلاح پسند یہودیت نے دروازوں پر مذہبی علامتوں کی تنصیب یا شادی کے موقع پر شیشہ توڑنے کی رسم کو ترک کردیا تھا لیکن اصلاح پسند یہودی مولویوں کی نئی نسل ان فرسودہ رسوم کو از سر نو زندہ کررہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس دکھ بھری زندگی میں اس طرح کی رسمیں نفسیاتی سکون کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

مغرب میں تیرہ کا ہندسہ گویا توہمات کی معراج ہے۔ اس ہندسے سے لوگوں میں جتنا ڈر اور خوف پایا جاتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بہت سی جگہوں پر گنتی میں تیرہ کا ہندسہ قصداً چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اٹلی کے شہر فلورنس میں آپ کو بارہ کے بعد تیرہ نمبر کا گھر دیکھنے کو نہیں ملے گا کہ اہل فلورنس نے اس ہندسے کے اثرات بد سے بچنے کے لیے بارہ کے بعد ساڑھے بارہ کا ایک نیا ہندسہ ایجاد کر رکھا ہے۔ اٹلی کی سرکاری لاٹری میں تیرہ کا ہندسہ سرے سے استعمال ہی نہیں کیا جاتا۔ جدید شہروں میں جہاں کثیر منزلہ عمارتیں تیرہویں منزل کے بغیر نہیں بن سکتیں وہاں بارہویں کے بعد چودھویں منزل کو شمار کرنا معمول کی بات ہے۔ ہوائی جہازوں میں تیرہویں قطار نہیں پائی جاتی اور بعض ایرپورٹ گیٹ نمبر تیرہ کو اپنی اسکیم سے

خارج رکھتے ہیں۔ عقل ودانش کے اس عہد میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ناموں میں تیرہ حروف کا پایا جانا انہیں مسلسل مشکلات وحوادث سے دوچار رکھ سکتا ہے۔ ایسے روحانی عاملوں کی کمی نہیں جو تیرہ کے ستم رسیدوں کو مختلف ہجوں کے ساتھ نئے انداز سے نام لکھنے کی ترکیب بتاتے ہیں اور اس کے عوض وہ خاصی رقم بھی اینٹھ لیتے ہیں۔

عہدِ ظلمت کی واپسی

جمہوریت پر سرمایہ داروں کی گرفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرانا نظامِ جبر نئے ناموں کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوگیا۔ گذشتہ چند سالوں میں بالخصوص عراق اور افغانستان پر امریکی قبضے کے بعد دنیا بھر میں جنگ مخالف جو مظاہرے ہوئے ہیں اس سے کم ازکم یہ بات تو پوری طرح منکشف ہوگئی ہے کہ جو لوگ سیاسی اقتدار پر قابض ہیں وہ عوامی جذبات واحساسات کی نمائندگی قطعی نہیں کرتے۔ اس سلسلے کی ایک قبیح مثال ہندوستان میں گجرات کا حالیہ الکشن ہے جہاں جمہوریت کی دیوی نے نریندر مودی کے سر پر دوبارہ تاج شاہی رکھ دیا ہے حالاں کہ ۲۰۰۲ء میں مودی نے جتنے بڑے پیمانے پر انسانیت کے خلاف سنگین ترین جرائم کا ارتکاب کیا وہ ہر خاص وعام کی معلومات کا حصہ ہے۔ ساری دنیا مودی کو لائق نفریں ٹھہراتی رہی لیکن جمہوریت کچھ ایسا تماشہ ہے کہ اس نے اتنے نمایاں مجرم کو قوت کی پناہ گاہ فراہم کردی۔ مغرب میں یہ احساس عام ہوتا جارہا ہے کہ جمہوریت کا عہدِ ذریں رخصت ہو چکا اب اس کی حثیت ایک ایسے ادارے کی ہے جسے سرمایہ دار مجرم اپنی کمین گاہ کے طور پر استعمال کررہے ہیں۔ فی زمانہ جمہوریت کا مطلب اسی عہدِ ظلمت کی واپسی ہے جب اہل اقتدار خفیہ طریقے سے اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے بہیمانہ ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں کوئی ۷۰۰ ایسی کمیں گاہیں ہیں جسے امریکی افواج نے قائم کررکھا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ ان کیمپوں میں انسانوں پر کیا گزر رہی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی نہیں معلوم کہ جن ملکوں میں یہ کیمپ واقع ہیں ان کی حکومتوں سے اس سلسلے میں امریکہ نے کیا معاہدہ کررکھا ہے۔ جو ممالک نیوکلیائی قوت کے طور پر جانے جاتے ہیں ان کے عام شہری کو اس بات کا کچھ بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ اس ملک کے پاس کتنے نیوکلیائی اسلحے موجود ہیں یا یہ کہ ان کا ملک حیاتیاتی اور کیمیاوی ہتھیاروں سے مسلح ہے یا نہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد جمہوری نظام کی سرّیت پر مختلف نئے قوانین کے ذریعے مزید پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں پیٹریاٹ ایکٹ اور برطانیہ میں دہشت گرد مخالف ایکٹ کے نفاذ کے بعد اب یہ معلوم کرنا پہلے سے کہیں زیادہ مشکل ہے کہ دفاعی وزارتوں کے زیر اہتمام ہمارے جمہوری حکمراں کیسے کیسے خطرناک منصوبے بنارہے ہیں۔ صورت حال اتنی خراب ہوگئی ہے کہ ۲۰۰۶ء میں امریکی کانگریس نے باقاعدہ یہ تجویز منظور کی کہ امریکہ میں تعذیبی مراکز کے قیام کے لیے فنڈ فراہم کیا جائے۔

مغرب میں عہدِ ظلمت کی واپسی پر عمومی بے چینی پائی جاتی ہے لیکن جمہوری نظام کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ نہ تو یہاں حزب مخالف کا کچھ بس چلتا ہے اور نہ ہی عوامی بے چینی اصلاح احوال کے لیے مؤثر ہوسکتی ہے۔ جو لوگ اقتدار پر قابض ہیں انہیں خوب معلوم ہے کہ عوامی مظاہرے اور مخالفین کی شعلہ بیانیاں ان کے اقتدار کے لیے خطرہ پیدا نہیں کرسکتیں۔ لہٰذا ایک بار جب کوئی شخص کرسیٔ اقتدار پر قابض ہوگیا تو اس نے جمہوری تماشے سے شخصی اقتدار کے استحکام کا خوب خوب کام لیا۔ مثال کے طور پر سابق امریکی صدر ابراہم لنکن کو لیجیے جن کے اقوال، جمہوریت کے معلم کی حیثیت سے، دانش گاہوں میں پڑھے پڑھائے جاتے ہیں انہوں نے اپنے دور میں پریس کی آزادی پر سخت قدغن لگائی۔ وڈرو ولسن اپنے جنگی عزائم کے سلسلے میں ناقدین کو قطعی برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے اور روزولٹ نے اپنے عہد میں جاپانی نژاد امریکی شہریوں پر گویا قیامت بپا کر رکھی تھی۔ اب رہے جارج واکر بش تو انہوں نے شہری حقوق کی گویا بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی ہے۔ نائب صدر ڈک چینی جنہیں سابق سی آئی اے سربراہ اسٹینڈس فیل ٹرنر نے بجا طور پر ''نائب صدر برائے تعذیب'' کے خطاب سے نوازا ہے، بانگ دہل تعذیب وتشدد کو ایک اخلاقی طریقۂ کار کے طور پر قبول کرلینے کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ جب ابوغریب جیل میں عراقی قیدیوں پر تعذیب وتشدد کے بہیمانہ واقعات دنیا کے علم میں آئے تو اس موقع پر نیویارک ٹائمس نے جو اداریہ لکھا وہ موجودہ عہد ظلمت کے سلسلے میں خاصا چشم کشا ہے:

> اس ہفتہ نائب صدر ڈک چینی نے ایک عجیب وغریب تجویز پیش کی۔ اب تک قیدیوں کی تعذیب کے سلسلے میں امریکی فوجیوں کی شمولیت اخلاقی اور قانونی طور پر مخمصے کا سبب رہی ہے۔ اس مخمصے سے بچنے کے لیے بسا اوقات یہ قیدی اپنی اپنی حکومتوں کو لوٹا دیئے جاتے ہیں جو امریکی اشاروں پر تعذیب وتشدد کی کاروائی انجام دیتے ہیں۔ مسٹر چینی چاہتے ہیں کہ بجائے اس کے کوئی دوسرا ہمارے لیے یہ کام انجام دے سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی کو اس کام کا قانونی اختیار دے دیا جائے۔ (اداریہ اکتوبر ۲۶، ۲۰۰۵ء)

تاریک خیالی

مذہبی علامتوں کے احیاء سے بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روحانی زندگی ایک بار پھر عود کر آئی ہے لیکن قریبی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ فی الواقع ہم ایک ایسے روحانی بیاباں میں رہنے پر مجبور ہیں جہاں روحانیت کے نام پر دراصل شیطان کی پرستش کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن ٹیلی ویژن کے پردوں پر مذاہب کے علمبردار اپنے مختلف پروگراموں کے ذریعے اس بات کا یقین دلاتے رہتے ہیں کہ نئی ٹکنالوجی نے ایک پرمسرت روحانی زندگی جینے کے امکانات پیدا کردیئے ہیں۔ عبادت گاہوں کے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہونے اور خصوصی مذہبی تقریبات میں شرکت کے لیے اب ٹیلی

ویژن کا آن کرنا کافی ہے۔نئی اطلاعاتی ٹکنالوجی نے عہد جدید کے مبلغین کی ایک قابل ذکر فوج تیار کردی ہے جو عہد قدیم کے فرسودہ دلائل کو نئے عہد کی بازیافت کے طور پر پیش کررہے ہیں۔ پیٹ روبرٹسن، جیری فیل ول اور آر البرٹ موہلر جیسے شہرت یافتہ مبلغین جو شب وروز یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ بائبل خدا کے الفاظ ہیں وہ شاید گذشتہ دوسو برسوں میں لکھی جانے والی بائبل کی علمی تنقید سے واقف نہیں۔لیکن انہیں اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ پروپیگنڈہ کے اس دور میں جسے ٹکنالوجی کی سہولت حاصل ہے وہ اپنے کمزور موقف کو بھی حقیقت کے طور پر پیش کرسکتا ہے۔نئی ٹکنالوجی نے تقریباً تمام ہی ملکوں میں پرانی ساخت کے مبلغین کو نئی زندگی عطا کردی ہے۔مغرب میں جہاں مذہبی زندگی کا خلا کچھ زیادہ محسوس کیا جاتا ہے نئے مبلغین کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ وہ عامۃ الناس کی ایک بڑی آبادی کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ انہیں خدا کا خصوصی قرب اور اعتماد حاصل ہے، وہ لوگوں کی الجھنوں اور پریشانیوں کا مداوا کرسکتے ہیں کہ ان کے پاس تمام مسائل کا مقدس حل موجود ہے شرط صرف یہ ہے کہ وہ ان خدمات کے عوض زر کثیر خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے عہد ظلمت کی طرف پلٹ رہے ہوں جہاں ملامت اتارنے اور جن وآسیب سے محفوظ رکھنے کے لیے نذرانے کی ادائیگی لازم سمجھی جاتی تھی۔

یہ ہے وہ روحانی دیوالیہ پن جسے ٹیلی ویژن مبلغین نے مذہب کا نام دے رکھا ہے۔مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ آسمانی کتابوں میں ہدایت کی تلاش کے بجائے ان مخفی رازوں کی نقاب کشائی کی کوشش کی جارہی ہے جن کا حصول ہمارے لیے خوش قسمتی کا باعث ہوسکتا ہو۔عیسائی نوجوانوں کی نئی نسل بائبل سے کہیں زیادہ اس کے مفروضہ رموز واشارات میں دلچسپی رکھتی ہے۔ خواب کی تعبیر، مستقبل گوئی، کائنات کی سِرّیت سے آگاہی، حتی کہ نوسٹرے ڈمس کی تحریریں یہ سب کچھ مذہبی لوگوں کی دلچسپی کا سامان بن گئے ہیں۔اگر ایک طرف مشرق میں زائچوں کا استعمال، قرآن مجید کی مخصوص آیات کے ورد یا مخصوص اوراد ووظائف کو حل المشکلات کے طور پر استعمال کرنے کا رواج بڑھا ہے تو دوسری طرف مغرب میں اہل مذہب کی دلچسپی ان امور پر مرکوز ہوگئی ہے کہ جنوں کو کیسے تابع کیا جائے، ان کی حقیقت کیا ہے، وہ دائیں سے بائیں اور آگے سے پیچھے کی طرف چلتے ہیں یا راست اوپر سے نیچے کی طرف ورود کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ وہ کتابیں ہیں جو بالغوں کے لیے لکھی گئی ہیں اور ان کا شمار بچوں کی طلسماتی کہانیوں میں نہیں ہوتا۔غلو کا یہ عالم ہے کہ بعض لوگ نئے طبّی طریقۂ علاج سے تنگ آکر بائبل کو متبادل کتابِ طب کے طور پر پڑھنے کی کوشش کررہے ہیں۔لوگوں میں ہر چیز کے سفلی حل کی طلب بڑھتی جارہی ہے۔ان کتابوں میں جو نئی روحانیت کے حوالے سے لکھی گئی ہیں ہر قسم کی واہیات وخرافات کو جگہ مل گئی ہے۔پچھلے دنوں مجھے مارک بوبیک کی ایک کتاب روحانی جنگ کی مبادیات (Spritual Warfare Basics) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔اس کتاب کے مطالعے سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نئے روحانیوں نے کس سج دھج کے ساتھ مذہب کا جنازہ نکالا ہے۔مصنف اس گرہ کی عقدہ کشائی کرتا ہے کہ کس

طرح خدا سے دعا کی جائے کہ وہ اس کے اعضائے مخصوص بشمول خون، ہڈی، بال، کھال حتی کہ اس کے خلیے کو بھی شیطانی رسوم بجالانے کی توفیق دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی خرافات کا بائبل سے کوئی تعلق نہیں لیکن مذہبی شائقین اپنی پیاس بجھانے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ مفید پاتے ہیں۔ ایسے لوگ جو خدا کے راست مشاہدے کے دعویدار ہوں مشرق میں شاید ان کے ظہور کا سلسلہ ختم ہو گیا ہو البتہ مغرب میں ہر آن ایسے مشاہدین حق کے ظہور کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ کی دلچسپی کی خاطر ہم یہاں کیتھرین ریس کا مقبول عام روحانی نغمہ نقل کرتے ہیں جس کے بارے میں مصنفہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہ نغمہ راست خدا سے حاصل کیا ہے:

اگر آپ خود کو بہت زیادہ سنجیدہ محسوس کرتے ہوں اور تقشّف نے آپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہو
تو ہمارے پاس آپ کے لیے ایک مشورہ ہے۔
یہ قدرے غیر روایتی تجویز ہے مگر ہے دلچسپ
اگر لوگ آپ کو حواس باختہ بھی کہیں تو اسے برا مت مانئے
آیئے اس اجتماعی تفریح میں شامل ہو جایئے جو خدا نے ہمارے لیے برپا کی ہے۔
ہم آج اتنی خوشی منائیں گے کہ خدا ناشناسوں کو یہ پتہ چل جائے گا۔
کہ اہل کلیسا کو خدا نے سیر و تفریح میں کسی سے پیچھے نہیں رکھا ہے۔
جبریل امین نے ہمارے لئے ٹورانٹو کے اس جلوۂ عظیم کا اہتمام کیا ہے۔
میں پہلے سمجھتی تھی کہ زندگی محض بردباری کا نام ہے۔
حتی کہ میں چیخ و پکار سے بھی احتراز کرتی اور یہ مجھ پر بہت شاق گذرتا
یہاں تک کہ روحِ خدائی نے میرے اندرون میں قہقہوں کی جوت جگا دی۔
اور اب میرا حال یہ ہے کہ میں جبریل امین کی پرداختہ ہوں، اپنے قابو سے باہر،
میری مثال اس انسان کی ہے جو خدا کی مستی میں سرشار ہو، اور اسی کی رسیا۔
میں مسیح کی آوارہ، اس کی چاہت کی تشنہ طلبی میں مبتلا،
اس عظیم روحانی شراب کی لذت کی ماری ہوں۔
بیا کہ جبریل امین ساقی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں،
اور میں مسلسل شرابِ روحانی کو منھ سے لگائے ہوئی ہوں۔

(Hank Hanegraaff, Counterfeit Revival, Dallas: World Publishing, 1997, pp.245-246)

یہ ہے وہ ظلمت پسند روحانیت جس کی ہر سو بہار آئی ہوئی ہے۔ ہے کوئی جوان نفسیاتی اور روحانی مریضوں کا علاج کرے۔ مغربی ذہن جو کبھی ہر شئے کی ماہیت کا متلاشی تھا، تحلیل و تجزے کے بعد رد و قبول کا رجحان رکھتا تھا آج مابعد جدید روحانیت کے زیر اثر اپنی حقیقت خود تخلیق کرنے کا داعی ہے۔ یہ اسی ظلمت پسندی اور محصور دماغی کا نتیجہ ہے کہ آج غور و فکر اور تحلیل و تجزیے کو جرم سمجھا جانے لگا ہے۔ ۲۰۰۶ء میں امریکی قوم کے نام خطاب میں جارج بش نے جو انداز اختیار کیا تھا وہ اس قبیل کی بہترین مثال ہے:

آج کی رات میں آپ کو ایک ایسے قانون کے اجراء پر آمادہ کرنا چاہتا ہوں جو طبی تحقیق کی بے سمتی روکنے کے لیے ہے۔ وہ مسائل ہیں انسانی کلوننگ اپنی تمام ہی شکلوں میں، مادۂ تولید کی تخلیق یا اس کی منتقلی، انسانوں اور جانوروں کی تخلیط اور مادہ تولید کی خرید و فروخت اور اس پر اجارہ داری۔

اس قسم کے تحکمانہ اور تنگ نظر اقدام سے کیا ایسا نہیں لگتا ہے کہ ہم ایک بار پھر اس عہدِ ظلمت میں واپس آ گئے ہوں جب عیسائی پیشواؤں نے گلیلو کو سائنسی تحقیق تجربے کے لیے قابلِ گردن زدنی قرار دیا تھا؟

مصیبت یہ ہے کہ جو لوگ اس بند دماغی کے مخالف ہیں وہ بھی ایک طرح کی انتہا پسندی کے شکار ہیں۔ وہ سائنس کو معروضی تجزیے کا موضوع بنانے کے بجائے اسے منصبِ خدائی پر فائز کر دیتے ہیں۔ وہ تعقل پسندی کے حامی تو ضرور ہیں البتہ وہ انسان کو مثلِ مشین سمجھتے ہیں اور اس کی تمام تر سریت سے اسے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ جدید سائنس سے اپنے تمام مسائل کے حل کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آنے والے دنوں میں مادۂ تولید کی ضروری اصلاح کے ذریعہ موروثی بیماریوں پر قابو پایا جا سکے گا۔ بہت سے پیچیدہ سماجی، نفسیاتی مسائل کے حل حتی کہ مجرموں کا سراغ لگانے میں بھی جینٹک کوڈ سے کام لیا جا سکے گا، جنین کی رپورٹ کی بنیاد پر شخص مذکور میں مخصوص صلاحیتوں کا پتہ لگانا ممکن ہوگا حتی کہ عالم سکرات کی ذہنی کیفیت کا مشینی زائچہ موت کی سریت سے بھی بہت سے پردے اٹھا دے گا۔ ابھی یہ کہنا شاید قبل از وقت ہو کہ ہم آنے والے دنوں میں نقص سے بڑی حد تک پاک انسان کی تخلیق کر سکیں گے یا نہیں البتہ اگر دنیا چہار ابعادی (Four Dimensional) ہے، جیسا کہ Special Theory of Relativity) کے حاملین کا خیال ہے تو مستقبل پہلے سے موجود کہیں بھٹک رہا ہے۔ تو کیا ہم دائرے میں دوبارہ اسی مقام پر واپس آ گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آگے راستہ مسدود ہے۔ ہم ایک بار پھر اپنے آپ کو صدیوں پرانی اس بحث میں الجھا پاتے ہیں کہ انسان آزاد ہے یا فیصلے پہلے سے لکھ دیئے گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سائنس کی خدائی ہمیں اس ظلمتِ شب سے نجات

دلا سکتی ہے اور نہ ہی ہیڈیگر، فوکو، دریدہ یا مابعد جدیدیت ہماری مسیحائی کا یارا رکھتے ہیں۔ ہمارے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں رہ جاتی کہ ہم عقل کو مسلسل کام پر لگائے رکھیں، سریت کے تحقیق و تجزیے پر قدغن نہ لگائیں، معانی کو قصداً نہ تو دبائیں اور نہ ہی اسے اوپر سے تھوپنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ سب کچھ کرنا اس وقت تک ممکن نہ ہوگا جب تک ہم میں حریتِ فکر کی بحث کو دوبارہ نئے خطوط پر ترتیب دینے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوتا۔